جمال میر صادقی کے افسانوں کے اردو تراجم کا جائزہ

An Analytical Study of the Urdu Translations of Jamal Mir Sadeqi's Short Stories

ڈاکٹر طاہرہ صدیقہ (اسسٹنٹ پروفیسر)
شعبہ اردو، کنیئرڈ کالج فار ویمن یونیورسٹی،لاہور۔

Dr. TahiraSiddiqa.
Assistant Professor, Department of Urdu ,
Kinnaird College For Women University, Lahore

سید مظفر الدین (ایم۔فل سکالر)
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،لاہور

Syed MuzafaraUdin (M Phil Scholar)

Government College University Lahore

Abstract

This study aims to analyze the Urdu translations of the short stories of Jamal Mir Sadeqi, a prominent contemporary Persian fiction writer, with particular focus on the linguistic, cultural, and stylistic aspects of translation. The research examines how the translators have transferred the themes, narrative techniques, cultural references, and literary aesthetics of the original Persian texts into Urdu. Employing a comparative and analytical approach, the study evaluates the degree of equivalence between the source and target texts and investigates the challenges involved in translating idiomatic expressions, cultural nuances, and stylistic features. The findings suggest that while the Urdu translations successfully convey the central ideas and emotional depth of Sadeqi's stories, certain modifications and adaptations are made to ensure readability and cultural accessibility for Urdu-speaking audiences. The study highlights the significant role of literary translation in fostering intercultural understanding and strengthening the literary relationship between Persian and Urdu traditions, while emphasizing the importance of balancing fidelity to the source text with the expectations of the target readership.

Key Words: Persian fiction, linguistic, Stylistic, translations, traditions, Short story,text

کلیدی الفاظ: فارسی فکشن، لسانیات، اسلوبیات، تراجم، روایات، افسانہ، متن

انسانی تہذیب کی تاریخ میں ترجمہ محض الفاظ کی ایک لسانی سانچے سے دوسرے لسانی سانچے میں منتقلی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ اصل متن کے پس منظر میں متحرک فکری لہروں، تہذیبی علامات، اور نفسیاتی و جذباتی کیفیات کو پوری معنویت کے ساتھ نئی زبان کے مزاج میں ڈھالنے کا ایک انتہائی پیچیدہ اور تخلیق کارانہ عمل ہے۔ ماضیِ قریب تک ادبی و علمی حلقوں میں ترجمہ کاری کو ایک ثانوی درجے کا کام سمجھا جاتا تھا، اور مروجہ علمی دانش میں اسے خالص تخلیقی سرگرمی تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی جاتی تھی۔ تاہم، جدید لسانیاتی اور ثقافتی مطالعات نے یہ ثابت کیا ہے کہ ترجمہ نگاری دراصل "جوئے شیر لانے" کے مترادف ایک مجتہدانہ اور تخلیقی فن ہے۔ اردو زبان جتنی قدیم ہے اس اتنی ہی قدیم اس زبان میں ترجمہ نگاری کی روایت ہے۔ ابتدائی عہد میں جب اردو اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی، تو دیسی معاشرے کی علمی و مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عربی، فارسی اور سنسکرت کے کلاسیکی متون کو اردو نثر میں منتقل کرنے کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہوا۔ ان ابتدائی تراجم کا بنیادی دائرہ کار مذہب، تصوف، اخلاقیات، داستانوں، شاعری، ہیئت اور فلسفے پر محیط تھا۔ انیسویں صدی سے قبل، برصغیر میں ترجمے کی تمام تر سرگرمیاں انفرادی سطح پر انجام دی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ترجمے کی روایت میں انفرادی کوششوں کی جگہ منظم اور ادارہ جاتی سرگرمیوں نے لے لی۔ ان اداروں میں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، دارالترجمہ عثمانیہ اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اہم ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں مسلم دورِ حکومت کے دوران سرکاری، تعلیمی اور درباری زبان فارسی تھی، جس کی وجہ سے فارسی زبان و ادب کے اثرات یہاں کی دیسی زبانوں پر گہرے اور ہمہ گیر تھے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں جب رُود کی صوبہ

خراسان میں فارسی شاعری کی شمع روشن کر رہے تھے، اسی دور سے برصغیر کا فکری رشتہ فارس سے جڑ چکا تھا۔ فارسی کے کلاسیکی شعری اثاثے، بالخصوص جلال الدین رومی کی چھ جلدوں پر مشتمل "مثنوی مولائے روم" کے متعدد اردو تراجم ہوئے۔ سعدی شیرازی کی "گلستان" اور "بوستان" کے اخلاقی اسباق کو بھی متعدد بار اردو نثر کا جامہ پہنایا گیا۔ فردوسی کے پچاس ہزار اشعار پر مشتمل عظیم رزمیہ "شاہنامہ فردوسی" کا اردو ترجمہ برصغیر کی زبانی اور تہذیبی تاریخ کا ایک بڑا کارنامہ ہے، جس نے قدیم ایرانی تمدن اور اساطیری کائنات کو اردو زبان کے اسلوب میں جذب کرلیا۔ اردو فکشن کا ابتدائی ڈھانچہ بڑی حد تک فارسی کی تمثیلی اور مہم جویانہ داستانوں کے تراجم سے تیار ہوا۔ میر تقی خیال کی پندرہ جلدوں پر مشتمل طویل داستان "بوستانِ خیال" اور فورٹ ولیم کالج کے دور میں قصہ چہار درویش کا اردو روپ "باغ وبہار"، "فسانہ عجائب، "طوطا کہانی" "مذہبِ عشق" ایسے تراجم ہیں جنہوں نے اردو نثر کو اس کی روایتی لفاظی اور ثقالت سے نکال کر عام فہم، سلیس اور اسلوبیاتی اعتبار سے انتہائی جاندار بنادیا۔ سفیر اختر فارسی سے اردو میں ترجمہ شدہ داستانوں کی ایک طویل فہرست پیش کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "اٹھارہویں صدی کے اردو مترجمین نے " انوار سہیلی" (کاشفی)، " پدماوت " (عبدالشکور بزمی)،"پدماوت "(عاقل خان رازی)،" قصۂ چہار درویش"(حکیم محمد علی معصوم)،"مثنوی خسرو و شیریں "(نظامی گنجوی)،"مثنوی لیلیٰ مجنون "(نظامی گنجوی)،"سنگھاسن بتیسی "(چتر بھج داس کائستھ)،"قصہ رضوان شاہ و روح افزا"(ناشناس)،"قصہ گل صنوبر "(ناشناس)،"قصہ کام روپ و کام لتا "(سید محمد مراد لائق)،"قصہ لعل و گہر"(ناشناس)،"مفرح القلوب "(تاج الدین مفتی)،"یوسف وزلیخا"(نور الدین عبدالرحمٰن جامی)اور دوسری فارسی عشقیہ اور اخلاقی داستانیں اردو میں منتقل ہوئیں"ا

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ایران کے سماجی، سیاسی اور ادبی منظر نامے پر نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مروجہ کلاسک داستانوں کی جگہ جدید رومانوی، وجودی، اور سماجی فکشن نے لے لی۔ جب ہم معاصر اردو فکشن کا تقابل جدید فارسی فکشن سے کرتے ہیں، تو دونوں میں فنی سطح

پر نمایاں مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ تاہم، جدید فارسی افسانے اور ناول میں موضوعاتی تنوع اردو کے مقابلے میں قدرے زیادہ رہا ہے، جس کی بنیادی وجہ ایرانی ادیبوں کی عالمی ادبیات سے گہری واقفیت اور مغربی فکشن کے شاہکاروں کا فارسی زبان میں تسلسل کے ساتھ ہونے والا ترجمہ ہے۔ جدید دور میں اردو اور فارسی میں دوریاں کافی بڑھ گئی ہیں اور فارسی سے اردو میں تراجم کا وہ سلسلہ سست رفتاری کا شکار ہے، لیکن انفرادی طور پر جدید ایرانی فکشن کو اردو کی قالب میں منتقل کرنے کا عمل جاری ہے۔ اردو میں فارسی ادب کے جن اہم فکشن نگاروں کی تحریروں کا ترجمہ ہو رہا ہے ان میں صادق ہدایت، سیمین دانشور، جلال آل احمد، غلام حسین ساعدی، بزرگ علوی، صادق چوبک اور معاصر افسانہ نگار جمال میر صادقی اہم ہیں۔

فارسی کے معاصر فکشن نگاروں میں جمال میر صادقی نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔ ان کی پیدائش ۱۹ مئی ۱۹۳۳ء کو تہران کے ایک متوسط علمی گھرانے میں ہوئی۔ انہوں نے تہران یونیورسٹی کے شعبہ ادبیات و علومِ انسانی سے فارسی ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد مختلف علمی اور سرکاری مناصب پر فائز رہے، جن میں لائبریرین، دستاویزاتی نگران، امتحانی طراح، اور تخلیقی فکشن نگاری کے معلم کے فرائض نمایاں ہیں۔ میر صادقی کی فکری آبیاری تہران یونیورسٹی کے ادبی ماحول میں ہوئی جہاں انہیں پرویز ناتل خانلری، محمد جعفر محجوب، شفیعی کدکنی اور مہرداد بہار جیسے جید اساتذہ اور ادیبوں کی صحبت اور سرپرستی میسر آئی۔ ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے ۱۹۵۸ء میں کیا جب ان کے ایک افسانے نے مجلہ "سخن" کے افسانوی مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کی، جس نے انہیں یکلخت ادبی حلقوں میں متعارف کروادیا۔ اطہر مسعود لکھتے ہیں کہ:

> "تہران یونیورسٹی سے گریجواشن کے دوران انہوں نے اس دور کے مشہور ادبی مجلے "سخن" کے زیر اہتمام ہونے والے افسانہ نگاری کے مقابلے میں اپنا افسانہ "برف ہا، سگ ہا، کلاغ ہا" بھجوایا جسے مقررہ حد سے طویل ہونے کی وجہ سے مقابلے میں شامل نہ کیا گیا لیکن اول انعام پھر بھی ان کے افسانے "مرد" کو ملا۔"۲

جمال میر صادقی کا پہلا افسانوی مجموعہ "شاہزادہ خانم سبز چشم" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا، جس کا عنوان بعد کی میں تبدیل کر کے "مسافرہای شب" رکھا گیا۔ انھوں نے اب تک 70 سے زائد کتب تصنیف کی ہیں جن میں 10 ناول، متعدد افسانوی مجموعے، ڈرامے اور فکشن کی تکنیک پر تحقیقی کتب شامل ہیں۔ معاصر فارسی فکشن میں جمال میر صادقی کا مقام اس لیے بھی منفرد ہے کہ انھوں نے جلال آلِ احمد اور ابراہیم گلستان جیسے سخت گیر نقادوں اور معاصرین کی کڑی تنقید کے باوجود اپنا ایک الگ، پر سکون اور یکسوئی والا راستہ منتخب کیا۔ میر صادقی کے فکری اسلوب پر اینٹون چیخوف، ولیم فاکنر، میکسم گورکی، لیوٹالسٹائی، اور ایرانی اساتذہ میں سے بزرگ علوی اور صادق چوبک کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں اطہر مسعود لکھتے ہیں کہ:

> "میر صادقی کے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں چیخوف، گورکی اور ٹالسٹائی شامل ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک ہیمنگوے اور فاکنر سے متاثر رہے اور فاکنر کا ناول The Sound ans the Fury بارہا پڑھا۔ میر صادقی کے خیال میں فاکنر کا افسانہ A Rose For Emily کلاسک کا درجہ رکھتا ہے ،"لیکن یہ اثر پذیری تکنیکی تھی معنوی نہیں۔"۳

جمال میر صادقی کا ناول "اضطرابِ ابراہیم" جسے وہ خود اپنی بہترین تخلیق قرار دیتے ہیں، ایرانی انقلاب کے ہنگامہ خیز دور میں ایک فرد کی نفسیاتی کشمکش کی لاجواب عکاسی کرتا ہے۔ ان کا فکشن اپنی آفاقیت، گہرے تاریخی شعور اور سماجی حقیقت پسندی کے باعث دنیا کی چودہ سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، جن میں اردو زبان کو ایک ممیز اور تاریخی مقام حاصل ہے۔

فارسی ادب اور فنونِ لطیفہ کے سنجیدہ پارکھ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود نے جمال میر صادقی کے فکشن کو اردو میں متعارف کرانے میں سب سے اہم اور منظم کردار ادا کیا ہے۔ ان کا ترجمہ کردہ افسانوی مجموعہ "جمال کہانیاں" پہلی بار ۲۰۱۲ء میں محض ۱۱ افسانوں کے ساتھ منظرِ عام پر آیا تھا، بعد ازاں، ۲۰۲۱ء میں اس کتاب دوسری اشاعت عمل میں آئی جس میں افسانوں کی تعداد بڑھا کر ۲۸ کر دی گئی۔ اس مجموعے میں بعد میں شامل ہونے والے افسانوں کے تراجم مختلف مترجمین نے کیے ہیں جن میں بصیرہ عنبرین، رشید

احمد قیصرانی ،شعیب احمد ،عظمی عزیز خان ،فلیحہ زہرا کاظمی ،معین نظامی ، نیر مسعود،شامل ہیں ۔اس مجموعے کی علمی اہمیت کو بڑھانے کے لیے اطہر مسعود نے آخر میں میر صادقی کاایک گرانقدر مقالہ "کچھ افسانہ نگاری کے بارے میں "شامل کیا،اور ساتھ ہی "جمال میر صادق (شخصیت اور افسانہ نگاری پر ایک نظر)" کے عنوان سے ایک طویل معلوماتی مضمون بھی تحریر کیا ہے۔اس کے علاوہ نیر مسعود نے میر صادقی کے دو افسانوں کا ترجمہ فارسی کہانیاں کے عنوان سے "آج" کے زیر اہتمام شائع کیا ہے جس میں دیگر فارسی افسانہ نگاروں کے افسانے بھی شامل ہیں۔

اطہر مسعود نے صادقی کے بارہ افسانوں کا ترجمہ کیا ہے جن میں "کمبخت برف"،"پہیہ زندگی کا "،"مرد"،"قہوہ خانہ نمبر 8"،"شکستہ شاخیں" ،" پربت کے اس پار"،"قتل نفس"،"سالگرہ "،"آئینے والی پری "، "جرمِ غریبی" ،"زندگی کا تھیٹر" اور سبز خواب جیسے مشہور افسانے شامل تھے۔ اور ان کے ترجمے کے تحت آنے والے افسانوں کا ماحول بالکل معاصر اور عصری ہے۔ ان کہانیوں میں کوئی دور افتادہ تاریخی یا غیر مانوس اساطیری فضا موجود نہیں ہے، بلکہ یہ اسی دنیا کی عکاسی کرتی ہیں جس سے معاصر قاری روزانہ گزرتا ہے۔جمال میر صادقی اپنی اصل فارسی تحریروں میں تہران کی عوامی اور بازاری بولی، غیر رسمی گفتگو اور بعض اوقات لغت سے باہر کے الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں تاکہ کہانی میں سچائی کارنگ گہرا کیا جا سکے۔اطہر مسعود کے تراجم کے بارے میں حافظ صفوان لکھتے ہیں کہ:

> "میں یہ کہہ سکتاہوں کہ میر صادقی کے افسانوں کی طرح ان کااردو ترجمہ بھی رواں دواں ہے، اور اس کی وحد وجہ جناب مترجم کی موسیقی اور علم عروض سے ایسی عملی آشنائی ہے جو روح میں اتری ہوئی ہے۔"[۴]

اطہر مسعود نے اردو ترجمہ کرتے وقت اس لسانی بگاڑ کو من و عن منتقل کرنے کے بجائے ایک شعوری فیصلہ کیا۔ انھوں نے ان اصطلاحات کو اردو کی شائستہ ادبی زبان کے سانچے میں ڈھالا تاکہ ادبیات کے طلبہ کے لیے متن کی افادیت برقرار رہے۔اگرچہ اس عمل سے ترجمے کا مزاج اصل فارسی کے مقابلے میں زیادہ رسمی اور سنجیدہ ہوگیا ہے، لیکن اس سے کہانی

کا بہاؤ اور قارئین کی دلچسپی کہیں سے بھی متاثر نہیں ہوتی اور تحریر صحافتی سطح پر گرنے سے بچ جاتی ہے۔ افسانہ "پہیہ زندگی کا" سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "ان دو آدمیوں کو دیکھا آپ نے؟ یہی جو آپ سے پہلے ٹیکسی سے اترے تھے۔ انھیں میں نے خیابان فرصت سے یہاں لایا تھا۔۔۔یہیں ہسپتال کے سامنے۔۔دونوں ڈاکٹر تھے۔ ساری رات جوا کھیلتے رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو کچھ زیادہ ہی ہارا تھا۔ خود ہی کہہ رہا تھا کہ رات قسمت کی دیوی مہربان نہ تھی۔ تو یوں سمجھے جناب کہ ہر شب ان کا یہی معمول ہے! آج رات کا بھی پروگرام بنا رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ آج بلائنڈ ہی کھیلے گا۔"۵

یہ افسانے محض ترجمے نہیں بلکہ ایک مکمل تخلیقی رنگ رکھتے ہیں۔ ان میں مترجم نے نہایت خوبی کے ساتھ اصل متن کی روح کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ ان افسانوں میں جمال میر صادقی کے فکر واحساس کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ مطالعے کے دوران کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کسی دوسری زبان یا تہذیب سے ترجمہ کیے گئے ہیں، بلکہ یہ خالص اردو افسانوں کی طرح قاری سے اپنا تعلق جوڑ لیتے ہیں۔ ان میں ایک مانوس فضا اور اپنائیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اطہر مسعود نے ترجمے میں نہایت سادہ اور رواں زبان استعمال کی ہے، جس کی وجہ سے قاری کو کسی مشکل لفظ یا پیچیدہ ترکیب کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ افسانہ "زندگی کا تھیٹر" میں اسٹیج کے مناظر کو خوبصورتی سے برتا ہے، جس سے مترجم کی فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

> "اداکار اور اداکارائیں میک اپ زدہ چہروں کے ساتھ سٹیج سے پچھلی جانب واقع ملگجی روشنی والے کمرے میں آجا رہے تھے، کچھ اداکار بیک سٹیج کام کرنے والے سٹاف کے ساتھ ادھر ادھر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ادھیڑ عمر کی ایک بنی ٹھنی عورت بیس پچیس سال کی جوان لڑکی کے ساتھ چائے پیتے ہوئے محو گفتگو ہے۔ لڑکی تھوڑی تھوڑی دیر بعد عورت کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اپنے سامنے والی جانب بڑے غور سے دیکھنے لگتی ہے جہاں رحمت اور پری بیٹھے تھے۔"٦

میر صادقی کے افسانوں میں منظر نگاری ایک نمایاں فنی خصوصیت ہے، جسے مترجم اطہر مسعود نے اردو میں نہایت خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ فارسی ادب میں فطرت سے قربت کا رجحان عام پایا جاتا ہے اور میر صادقی کے افسانوں میں بھی یہ وصف نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی منظر کشی نہ صرف دلکش ہے بلکہ قاری کو اپنے ماحول اور فضا میں پوری طرح جذب کر لیتی ہے۔ ان کے افسانوں کے بیشتر مناظر ایران کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر سے وابستہ ہیں، جن میں فطری مناظر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ خصوصاً "پہیہ زندگی کا"، "پربت کے اس پار" اور "آئینے والی پری" میں منظر نگاری اپنی بہترین صورت میں سامنے آتی ہے۔ اطہر مسعود نے ترجمے کے دوران ان تمام مناظر کی خوبصورتی اور تاثیر کو برقرار رکھا ہے۔ اسی طرح افسانہ "مرد" میں پیش کی گئی منظر کشی ملاحظہ کیجئے:

> "اس مکان کی چھت خاصی اونچی تھی۔ یہاں سے محلے گلیاں اور بے ترتیب بنے ہوئے مکان بھول بھلیوں کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ گلیوں میں آج غیر معمولی چہل پہل تھی ۔روایتی چغے اور واسکٹیں پہنے ،رنگبرنگی پگڑیاں باندھے ہوئے مرد اور سفید جالی دار نقاب اوڑھے چادروں میں لپٹی ہوئی عورتیں ادھر ادھر جا رہے تھے۔"۷

یہ اقتباس میر صادقی کے افسانوں میں منظر نگاری کی ایک واضح اور نمائندہ مثال پیش کرتا ہے، جس میں شہری فضا اور سماجی ماحول کو بڑی باریکی سے دکھایا گیا ہے۔ مکان کی اونچی چھت سے نیچے پھیلا ہوا گلیوں کا منظر قاری کے سامنے ایک پیچیدہ مگر منظم تصویر کی صورت میں ابھرتا ہے، جہاں گلیاں بھول بھلیوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔ اس منظر میں صرف عمارتوں کی ساخت ہی نہیں بلکہ انسانی سرگرمیاں بھی پوری تفصیل کے ساتھ دکھائی گئی ہیں، جو اس فضا کو مزید جاندار بنا دیتی ہیں۔ مختلف لباسوں میں ملبوس مرد و خواتین کی آمد و رفت اس معاشرے کی تہذیبی جھلک پیش کرتی ہے اور ایک روایتی ماحول کو اجاگر کرتی ہے۔

اطہر مسعود نے اس منظر کو ترجمے میں نہایت مہارت سے برقرار رکھا ہے، جس سے اصل متن کی تاثیر اور فطری حسن مجروح نہیں ہوتا بلکہ مزید نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ منظر نہ صرف بصری تاثر پیدا کرتا ہے بلکہ قاری کو اس عہد کے سماجی اور ثقافتی ماحول سے بھی روشناس کراتا ہے۔

میر صادقی کے افسانوں کے کردار عموماً ایرانی معاشرے کے عام لوگوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں زیادہ تر کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جبکہ بعض کردار تاریخی پس منظر بھی رکھتے ہیں۔ ان کے کردار زندگی کی حقیقی صورتِ حال، معاشرتی مسائل، انسانی کمزوریوں اور نفسیاتی کشمکش کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ مصنف نے کرداروں کو محض کہانی کا حصہ بنانے کے بجائے انہیں جیتے جاگتے انسانوں کی صورت میں پیش کیا ہے، جن کے جذبات، خواہشات، محرومیاں اور خواب قاری کو اپنے اردگرد کے لوگوں کی یاد دلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار مصنوعی یا فرضی محسوس نہیں ہوتے بلکہ اپنے فطری انداز، روزمرہ گفتگو اور انسانی رویّوں کے باعث قاری کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ میر صادقی کی کردار نگاری کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے ایرانی معاشرے کے مختلف طبقات، تہذیبی اقدار اور سماجی تبدیلیوں کو نہایت مؤثر انداز میں اجاگر کرتے ہیں۔ حافظ صفوان لکھتے ہیں کہ:

> "میر صادقی نہ صرف ایک ادیب بلکہ ایک سماجی سائنسدان کی حیثیت سے سماج کی زیریں سطح کے کرداروں سے کام لیتے ہیں، اور یہ کردار ڈرائیور، پہلوان، کلرک، قصائی، گھریلو عورت، نشئی، ہوٹل کا بیرا وغیرہ، کوئی بھی ہو سکتا ہے، میر صادقی ان سب کرداروں سے ان کی مخصوص زبان استعمال کراتے ہیں ۸"۔

صادقی کردار نگاری کے فن میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے کردار اس قدر حقیقت سے قریب ہوتے ہیں کہ قاری ان میں اپنی زندگی اور اپنے اردگرد کے لوگوں کی جھلک محسوس کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں زندہ اور متحرک کرداروں کے ساتھ ساتھ مردہ کردار بھی اس انداز سے پیش

کیے گئے ہیں کہ وہ مکمل طور پر جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔ صادق نے اپنے کرداروں کے حلیے، گفتگو، عادات و اطوار اور ظاہری خدوخال کو نہایت باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ مترجم اطہر مسعود نے بھی ان کرداروں ان کی مکمل روح کے ساتھ اردو کا جامع پہنایا ہے۔ افسانہ "مرد" میں ایک لڑکے کے کردار کو نہایت باریکی سے پیش کیا ہے۔

> "خوبصورت چہرے، روشن اور ہیجان آنکھوں، کمزور جسم اور سیاہ بالوں والا یہ لڑکا جس کی ابھی مسیں بھگ رہی تھیں، اپنی عمر سے کچھ بڑا ہی دکھائی دیتا تھا۔ گھنٹوں تک لمبی لمبی قمیض پہنے تپتی ہوئی چھت پر منہ کے بل لیٹ کر وہ بڑی محویت سے صحن میں موجود عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔"۹

میر صادق نے اپنے کرداروں کا حلیہ نہایت خوبصورتی اور باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ اطہر مسعود نے ان تمام جزئیات کو پوری دیانت داری کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔ انھوں نے صادق کے کرداروں کو ان کی اصل خصوصیات کے ساتھ اردو زبان کا حصہ بنایا ہے۔ کرداروں کے درمیان ہونے والے مکالمے بھی نہایت فطری اور مؤثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان تراجم کا مطالعہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اطہر مسعود نے میر صادق کے فن اور اسلوب کو گہرائی سے سمجھا ہے۔ وہ ان کے موضوعات، علامتوں اور فکری جہات مکمل واقف ہیں۔ اسی لیے ان کے تراجم میں میر صادق کی اصل تخلیقی روح برقرار رہتی ہے اور قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ مصنف کے اصل فن پاروں سے براہِ راست روبرو ہے۔

بصیرہ عنبرین نے بھی میر صادق کے افسانوں کے تراجم میں اپنی مترجمانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ ان کے ترجمہ کردہ افسانے "دیوار"، "ہرے بھرے اشجار" اور "خوفِ خدا" اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ فارسی زبان و ادب پر گہری دسترس رکھتی ہیں۔ انھوں نے براہِ راست فارسی متن کو سامنے رکھ کر متن کے اصل مفاہیم اور فکری جہات کو محفوظ رکھا ہے بلکہ اس کی ادبی چاشنی اور اسلوبی حسن کے ساتھ اردو زبان کا روپ عطا کیا۔ یہ تراجم میں زبان کی شگفتگی، روانی اور سلاست نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ وہ لفظی ترجمے کے

بجائے مفہوم اور تاثر کو اہمیت دیتی ہیں، جس کے باعث افسانوں کی فضا، کرداروں کے جذبات اور واقعات کی تاثیر اردو قاری تک پوری قوت کے ساتھ پہنچتی ہے۔ افسانہ " دیوار " سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> " شدت غم سے اس کا حلق خشک ہو چکا تھا اور جی چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے ۔ اس نے رقابت اور عداوت سے بھرپور ایک نگاہ زیر تعمیر دیوار اور پھر راج مزدوروں پر ڈالی ۔ اسے دیوار سے، معماروں سے، ان سب سے، کس قدر نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ "۱۰

ان کا ترجمہ اس قدر فطری اور رواں ہے کہ قاری کو کہیں بھی اجنبیت یا ترجمہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا بلکہ یہ افسانے اردو ادب کی اصل تخلیقات کا گمان دیتے ہیں۔ یہی خوبی ان کے تراجم کو ادبی اعتبار سے اہم اور قابلِ قدر بناتی ہے۔

اس مجموعے میں شامل تین اہم افسانے "پارک میں آدمی"، "سمندر کی بیداری" اور "لمحۂ اسیری" شعیب احمد کے ترجمہ کردہ افسانے ہیں۔ شعیب احمد نے ان افسانوں کا ترجمہ نہایت مہارت، فنی شعور اور لسانی سلیقے کے ساتھ انجام دیا ہے۔ انھوں نے اصل متن کے مفہوم، اسلوب اور فکری جہات کو برقرار رکھتے ہوئے اس انداز میں اردو کا رنگ عطا کیا ہے کہ ترجمہ کہیں بھی اجنبی یا ثقیل محسوس نہیں ہوتا۔ ان کے ترجمے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اصل افسانوں کی فضا، کرداروں کے جذبات اور واقعات کی تاثیر کو پوری شدت کے ساتھ اردو قاری تک پہنچانے میں کامیاب رہے ہیں۔ افسانہ "سمندر کی بیداری" سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "شہر، شہر بیداری ہے ۔ اس کی راتیں تاریک، دن پگھلا دینے والے اور لوگ حواس باختہ جانور ۔۔۔ شہر میں کوئی نہیں آتا ۔ شہر سے کوئی نہیں جاتا ۔ شہر لوگوں سے خالی ہو گیا ہے اور خشک سالی نے لوگوں کو شہر سے نکال کر تتر بتر کر دیا ہے۔ "۱۱

شعیب احمد نے زبان کی سادگی اور روانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے افسانوں کی ادبی خوبصورتی کو بھی محفوظ رکھا ہے، جس کے باعث یہ تراجم محض لفظی منتقلی نہیں بلکہ ایک تخلیقی ادبی تجربے کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ان تراجم کے ذریعے اردو قارئین کو میر صادقی کے فنِ افسانہ نگاری اور ایرانی معاشرت کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

فلیحہ زہرا نے میر صادقی کے تین اہم افسانوں ''دو پرندے''، ''دوستی'' اور ''بیچارہ'' کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان تراجم میں انہوں نے اصل فارسی متن کے مفاہیم، جذبات اور فنی لطافت کو پوری دیانت داری کے ساتھ اردو قالب میں منتقل کیا ہے۔ فلیحہ زہرا کی مترجمانہ صلاحیت کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے زبان کی سادگی اور روانی کو برقرار رکھتے ہوئے افسانوں کے تہذیبی اور سماجی پس منظر کو بھی محفوظ رکھا ہے۔ ''دو پرندے'' میں علامتی اندازِ بیان، ''دوستی'' میں انسانی تعلقات کی نزاکت اور ''بیچارہ'' میں کردار کی داخلی کیفیت کو انھوں نے نہایت مؤثر انداز میں اردو میں پیش کیا ہے۔ افسانہ " دو پرندے " سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> " اس نے اپنا قلم کاپی پر رکھا اور کھڑا ہوا گیا۔ جو نہی اس نے کھڑکی سے سر باہر نکالتے ہوئے تازہ ہوا کو اپنے اندر سمویا، زمین میں گرتی ہوئی بارش کے سبب مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی اس کے اندر اتر کر اس کی قوت مشامیت کو خوشگرار کر گئی۔ بارش کے درشت اور بلوریں قطرے گلی میں مسلسل برس رہے تھے۔ "۱۲

اس کے علاوہ عظمیٰ عزیز خان نے بھی میر صادقی کے دو اہم افسانوں ''پرندے'' اور ''عورت نے اپنا ہیٹ اتارا'' کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ ان کے تراجم میں زبان کی سلاست، روانی اور ادبی شائستگی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے فارسی متن کے مفاہیم، جذبات اور فکری جہات کو پوری دیانت داری کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔ رشید احمد قیصرانی کا ترجمہ کردہ افسانہ "انقلاب" اس مجموعے کا واحد سیاسی افسانہ ہے، جس کا پس منظر ۱۹۷۹ء کا

انقلابِ ایران ہے۔ اس کہانی میں میر صادقی نے کمال ہنر مندی سے ان سرکاری خفیہ کارندوں کی داخلی نفسیات کو آشکار کیا ہے جو دفتری فرائض کو پسِ پشت ڈال کر انقلابی جلوسوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ تاہم، یہ سیاسی پس منظر بھی بہت جلد کہانی کے مرکزی پلاٹ میں مدغم ہو کر تحلیل ہو جاتا ہے اور قاری کے سامنے خالص انسانی جبلت کا گہرا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"میں نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو لاٹھی ٹیکتا ہوا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔
بعض لوگ جلوس کے استقبال کے لیے آگے آئے ہوئے تھے، بعض رو رہے تھے اور
بعض جلوس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے۔"۱۳

ڈاکٹر معین نظامی نے جمال میر صادقی کے تین افسانوں کا ترجمہ "جنازہ"، "سیاہ ندی اور بندر اور جگنو" کے نام سے کیا ہے۔ "بندر اور جگنو" کی کہانی پسماندہ اور قدامت پرست طبقے کے اس فکری جمود پر گہرا طنز ہے جو اپنے فرسودہ خیالات پر فخر کرتے ہیں اور مادی و سائنسی ترقی کرنے والے اپنے معاصرین کو گمراہ اور معتوب سمجھتے ہیں۔ معین نظامی نے کلیلہ و دمنہ کے اسلوبیاتی رچاؤ کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کہانی کا ایسا علامتی ترجمہ کیا ہے جو ہم عصر برصغیر کے سیاسی اور مذہبی تضادات کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"ان کی یہ حرکتیں بھی مبنی بر غفلت ہیں جو بندر اگلے جہان سے غافل ہو وہ محض اس دو روزہ دنیا کی فکر میں ہوتا ہے۔ اگر سردیاں زیادہ سرد ہوں تو اس کی مشیت ہے۔ حقیر بندر بھلا کیا کر سکتا ہے؟ تقدیر سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ ہم برسوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔ درست ہے کہ سردیوں میں خوب سردی ہو جاتی ہے لیکن ہمیں کبھی آگ کی ضرورت نہیں پڑی، نہ ہم نے کبھی ایندھن اکٹھا کیا۔"۱۴

اس افسانے میں میر صادقی نے بندروں کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ایسے لوگوں کی ذہنیت پر طنز کیا ہے جو اپنی سستی، غفلت اور بے عملی کو تقدیر کا نام دے کر ہر ذمہ داری سے بچنا چاہتے ہیں۔ بندروں کا یہ خیال کہ سردیوں کی تیاری کرنا بے فائدہ ہے اور جو کچھ ہوگا تقدیر کے مطابق ہوگا، دراصل ان انسانوں کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے جو حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے

قسمت کے سہارے بیٹھے رہتے ہیں۔ مصنف یہ واضح کرتا ہے کہ صرف تقدیر پر بھروسہ کرنا اور اپنی ذمہ داریوں سے غافل رہنا دانشمندی نہیں بلکہ نقصان کا سبب بنتا ہے۔ اس علامتی انداز کے ذریعے صادقی نے معاشرے میں موجود اس منفی رویے کو بے نقاب کیا ہے اور انسان کو تدبیر، محنت اور دور اندیشی کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔

نیر مسعود نے صادقی کے دو افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے پہلے افسانے کا ترجمہ "ہوا کی ہوک" کے عنوان سے کیا ہے۔ کہانی ایک بوڑھے شخص کی داخلی دنیا، اس کی تنہائی اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس کے نفسیاتی اضمحلال کی جذباتی عکاسی کرتی ہے۔ اور دوسرے افسانے کا ترجمہ "کنکریٹ کے انباروں کے ادھر" کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ افسانہ جدید شہری منصوبہ بندی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی لامتناہی تنہائی کو موضوع بناتا ہے۔ مسٹر عارفی جو کہ ایک متوسط دفتری ملازم ہیں، جب اپنے جدید نو تعمیر شدہ فلیٹ سے باہر نکلتے ہیں تو کنکریٹ کے پہاڑوں اور سڑکوں کے طلسم میں گم ہو جاتے ہیں۔ نیّر مسعود کے اس ترجمے میں ان کا مخصوص افسانوی اسلوبِ نگارش جھلکتا ہے۔ انہوں نے میر صادقی کے بیانیے کی پراسراریت، خوف اور جدید صنعتی نظام کے پیدا کردہ جبر کو اردو نثر میں اتنی خوبصورتی سے پرویا ہے کہ یہ اردو افسانوی روایت کا اپنا حصہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ افسانہ "کنکریٹ کے انباروں کے ادھر" سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "چاروں ہاتھ پیروں سے وہ کنکریٹ کے انبار پر چڑھ رہے تھے اور ہانپ رہے تھے ۔بڑے سے بیگ کو وہ اپنے پیچھے پیچھے کنکریٹ پر گھسیٹ رہے تھے ۔کنکریٹ کے ریزر ان پیروں سے بل بل کر کھر کھر کرتے نیچے لڑھک رہے تھے ۔وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے انبار کی چوٹی تک لے گئے ۔اب وہ تھک کر چور ہوچکے تھے۔ان کی آنکھوں نے دیکھا کہ کنکریٹ کے انباروں کے اس طرف ایک سبز میدان دور تک چلا گیا ہے اور سارے میں حسین سنہری دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔"۱۵

اس افسانے میں میر صادقی نے جدید انسان کی مسلسل جدوجہد، تھکن اور بہتر زندگی کی تلاش کو نہایت مؤثر علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ کنکریٹ کے انبار جدید شہری

تہذیب، مصنوعی ترقی اور مادّی دوڑ کی علامت ہیں جن پر چڑھتے ہوئے کردار شدید مشقت اور اذیت کا سامنا کرتے ہیں۔ ان کے پیروں تلے لڑھکتے ہوئے کنکریٹ کے ریزے اس سفر کی دشواری اور عدم استحکام کو ظاہر کرتے ہیں۔ تاہم جب وہ چوٹی پر پہنچتے ہیں تو ان کے سامنے پھیلا ہوا سبز میدان اور سنہری دھوپ امید، سکون اور فطری زندگی کی علامت بن کر ابھرتے ہیں۔ صادقی اس منظر کے ذریعے جدید سماج پر گہرا طنز کرتے ہیں کہ انسان مصنوعی ترقی کے بوجھ تلے اپنی توانائیاں صرف کرتا رہتا ہے، حالانکہ حقیقی خوشی، آسودگی اور حسنِ حیات فطرت کے قریب اور سادہ زندگی میں پوشیدہ ہے۔ یوں یہ اقتباس جدید معاشرتی رویّوں، ترقی کے نام پر بڑھتی ہوئی مادّہ پرستی اور انسان کی داخلی بے چینی کی ایک بامعنی عکاسی کرتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو انسانی تہذیب میں ترجمہ کاری محض الفاظ کی منتقلی نہیں بلکہ ایک انتہائی پیچیدہ، تخلیقی اور دو تہذیبوں کو جوڑنے والا فن ہے۔ اردو ادب میں فارسی سے ترجمے کی روایت بہت قدیم اور مستحکم رہی ہے، جس نے کلاسیکی دور سے لے کر فورٹ ولیم کالج کی داستانوں تک اردو نثر کو سلیس، رواں اور جاندار بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اگرچہ جدید دور میں یہ سلسلہ قدرے سست ہوا ہے، تاہم معاصر دور میں جدید ایرانی فکشن کو اردو میں منتقل کرنے کی انفرادی کوششیں جاری ہیں۔ اس حوالے سے معاصر فارسی ادب کے اہم سنگِ میل، جمال میر صادقی کے سماجی، نفسیاتی اور علامتی فکشن کو اردو دنیا میں متعارف کرانے میں ڈاکٹر محمد اطہر مسعود اور ان کے ساتھی مترجمین (جیسے نیر مسعود، بصیرہ عنبرین اور شعیب احمد وغیرہ) نے "جمال کہانیاں" کے ذریعے نہایت اہم اور منظم کردار ادا کیا ہے۔ ان مترجمین نے میر صادقی کے تہرانی عوامی اسلوب کو اردو کی شائستہ، سادہ اور باا‌ثر ادبی زبان میں اس مہارت سے ڈھالا ہے کہ ان کے ترجمہ کردہ کردار، ایرانی معاشرے کی منظر نگاری، اور جدید مادہ پرستی پر کیے گئے گہرے طنز کی اصل روح اور تخلیقی بہاؤ اردو قاری کے لیے بالکل مانوس اور دلکش محسوس ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سفیر اختر، فارسی سے اردو میں ترجمے کی روایت (آغاز سے ۱۸۵۷ء تک)، اسلام آباد: فکر و نظر، شمارہ نمبر ۳، جلد ۴۵، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۱۴

۲۔ اطہر مسعود، جمال کہانیاں، لاہور: فکشن ہاوس، ۲۰۲۱ء، ص: ۱۸۷

۳۔ ایضاً۔۔۔ ایضاً، ص: ۱۸۸

۴۔ حافظ صفوان، ایرانی افسانہ نگار جمال میر صادقی اور ڈاکٹر اطہر مسعود کی ترجمہ نگاری، آن لائن (ہم سب) https://www.humsub.com.pk/415687/hafiz-safwan-2/#google_vignette

۵۔ اطہر مسعود، جمال کہانیاں، لاہور: فکشن ہاوس، ۲۰۲۱ء، ص: ۱۹

۶۔ ایضاً۔۔۔ ایضاً، ص: ۶۹

۷۔ ایضاً۔۔۔ ایضاً، ص: ۲۴

۸۔ حافظ صفوان، ایرانی افسانہ نگار جمال میر صادقی اور ڈاکٹر اطہر مسعود کی ترجمہ نگاری، آن لائن (ہم سب) https://www.humsub.com.pk/415687/hafiz-safwan-2/#google_vignette

۹۔ اطہر مسعود، جمال کہانیاں، لاہور: فکشن ہاوس، ۲۰۲۱ء، ص: ۲۵

۱۰۔ ایضاً۔۔۔ ایضاً، ص: ۹۸

۱۱۔ ایضاً۔۔۔ ایضاً، ص: ۱۳۷

۱۲۔ ایضاً۔۔۔ ایضاً، ص: ۱۵۵

۱۳۔ ایضاً۔۔۔ ایضاً، ص: ۱۲

۱۴۔ ایضاً۔۔۔ ایضاً، ص: ۱۶۹

۱۵۔ نیر مسعود، فارسی کہانیاں، کراچی: سٹی بک پریس، ۲۰۱۳ء، ص: ۶۱